اصنافِ نظم ونثر

(الف) اصنافِ نظم

نظم عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ''موتیوں کو ایک لڑی میں پرونا'' کے ہیں لیکن ادب کی اصطلاح میں لفظوں کا معیّن ضابطوں کے مطابق استعمال نظم کہلاتا ہے اور یہ لفظ ''نثر'' کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ چند اہم اصنافِ نظم مندرجہ ذیل ہیں:

حَمد

حَمد ایک ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی شان، بزرگی اور عظمت کو بیان کیا جاتا ہے۔ حَمد کا لفظ باری تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔ حَمد کے لیے کوئی خاص بحر یا ہیئت مقرر نہیں مگر اردو شاعری میں حَمد کو ایک خاص تقدّس اور مقام حاصل ہے۔ دو معروف و مقبول حَمدوں کے ابتدائی شعر ملاحظہ کیجیے:

کامل ہے جو ازل سے، وہ ہے کمال تیرا　　باقی ہے جو ابد تک، وہ ہے جلال تیرا (حالی)
دوسرا کون ہے، جہاں تُو ہے　　کون جانے تجھے، کہاں تو ہے (امیر)

نَعت

نعت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی تعریف کرنا کے ہیں، لیکن اصطلاح میں یہ لفظ مدحتِ رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کے لیے وقف ہو چکا ہے۔ جہاں تک نعت کا تاریخی معاملہ ہے، اس کا آغاز آپ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں ہو گیا تھا اور یہ سلسلہ آج تک پورے تُزک و احتشام کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ نعت گوئی نہایت باریک فن ہے اور نعت گو کو ہر لمحہ حزم و احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ، جو کہ فارسی زبان کے شاعر ہیں، کی یہ عربی نعت بھی زبانِ زدِ عام ہے:

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ　　کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ　　صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ آلِہٖ

ذیل میں مختلف زمانوں کے تین شعرا کے نعتیہ اشعار کی کچھ مثالیں درج کی جا رہی ہیں:

محسن کاکوروی: سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل　　میرے ایمانِ مفصّل کا یہی ہے مجمل
حفیظ تائب: خوش خصال و خوش خیال و خوش خبر خیر البشر　　خوش نژاد و خوش نہاد و خوش نظر خیر البشر
احمد رضا خان بریلوی: واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بطحا تیرا　　نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

قصیدہ

قصیدہ عربی کے لفظ قصد سے مشتق ہے جس کے معنی ارادہ کرنے کے ہیں، مگر قصیدہ سے مراد ایسی شاعری ہے جس میں شاعر ارادتاً

کسی کی تعریف وتوصیف کرتا ہے اور اس ضمن میں بعض اوقات زمین آسمان کے قُلا بے ملا دیتا ہے۔قصیدے کا پہلا شعر مطلع اور آخری شعر (جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے) مقطع کہلاتا ہے۔

قصیدہ ایک قدیم صنفِ سخن ہے اور یہ عربی، فارسی زبان وادب میں وافر ذخیرے کی صورت میں موجود ہے۔زمانۂ قدیم سے قصیدے اور غزل کی ہیئت ایک ہی ہے، وہی مطلع ومقطع اور وہی آغاز سے اختتام تک ردیف اور قافیے کا اہتمام ہے۔قصیدے کو عام طور پر چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

ا۔تشبیب: یہ قصیدے کا ابتدائی حصّہ ہے جس میں شاعر جذباتِ محبت یا خوب صورت فطری مناظر کا ذکر کرتا ہے اور جس کی انتہا سے ممدوح کی مدح کا آغاز ہوتا ہے۔

۲۔گریز: اس حصے میں ایک دو ایسے شعر ہوتے ہیں جو تشبیب کو مدح سے ملاتے ہیں۔

۳۔مدح: یہ وہ حصّہ ہے جس کی خاطر شاعر قصیدہ لکھتا ہے۔اس حصّے میں شاعر اپنے ممدوح کی خوب تعریف وتوصیف کرتا ہے اور اپنی فصاحت وبلاغت اور زبان دانی کے دریا بہا دیتا ہے۔

۴۔دعا: یہ قصیدے کا آخری حصّہ ہے، اس میں شاعر اپنے ممدوح کو دعا دیتا ہے اور بعض اوقات حسنِ گفتار کے ذریعے اپنا صِلہ بھی طلب کرتا ہے مثلاً: مرزا غالب کے قصیدے کے یہ دعائیہ اشعار دیکھیے:

خَتم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اردو قصیدہ گوئی کے حوالے سے مرزا محمد رفیع سودا، شیخ ابراہیم ذوق اور اسد اللہ خاں غالب کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

غزل

غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کے حسن وجمال کی تعریف کرنا کے ہیں۔ایک روایت یہ بھی ہے جب غزال (ملکِ عرب کا آہو) کو شکاری کتے دبوچتے ہوں تو اس کے مُنھ سے جو دردناک چیخ نکلتی ہے، اسے غزل کہتے ہیں۔گویا غزل میں عشق ومحبت اور سوز ودرد کا بہت نمایاں ہونا ضروری ہے۔مرزا غالب کی ایک معروف غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

مرثیہ

مرثیہ عربی زبان کے لفظ رثا سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں غم والم کے انداز میں کسی مرنے والے کا ذکرِ خیر کرنا اور اس کے

اوصاف بیان کرنا۔ اردو ادب میں سب سے زیادہ مرثیہ شہیدانِ کربلا کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ اس حوالے سے شہدائے کربلا کے مناقب اور مصائب بیان کرنے میں خلیق و ضمیر اور انیس و دبیر نے بہت شہرت پائی اور لازوال رثائی ادب یادگار چھوڑا۔

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی　　　ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی　　(میر انیس)

مذکورہ شعرا کے علاوہ مرزا غالب، مولانا حالی، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، افتخار عارف، محسن نقوی اور وحید الحسن ہاشمی وغیرہ نے بھی اس صنف میں مقبولیت حاصل کی ہے۔ سانحہ کربلا کے حوالے سے مرثیہ کے درج ذیل اجزائے ترکیبی ہیں:

• چہرہ　• سراپا　• رخصت　• آمد　• رجز　• جنگ　• شہادت　• بین　• دعا

مرثیہ کی اقسام: مرثیے کی عموماً چار اقسام بیان کی جاتی ہیں جن میں 1۔ رسمی مرثیہ 2، قومی مرثیہ 3۔ شخصی مرثیہ 4۔ مذہبی مرثیہ شامل ہیں۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے معروف شخصی مرثیے ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' سے یہ دو شعر ملاحظہ کیجیے:

کس کو ہوگا اب وطن میں آہ ! میرا انتظار　　　کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا　　　اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا!

مثنوی

مثنوی اردو کی ایک مقبول صنفِ نظم ہے۔ مثنوی میں ہر شعر کے دونوں مصرعے آپس میں ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں اور تمام شعر ایک دوسرے سے جداگانہ قافیہ و ردیف رکھتے ہیں۔ مسلسل قافیے کی عدم پابندی کی وجہ سے اس صنف میں لمبے چوڑے تاریخی واقعات اور طویل قصے کہانیاں سہولت کے ساتھ نظم کیے جا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی اور اردو میں بعض مثنویوں کے اشعار کی تعداد سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں تک ہے۔ مولانا حالی کے نزدیک مثنوی سب سے کارآمد صنفِ نظم ہے۔ اردو ادب میں دیا شنکر نسیم، میر حسن، میر تقی میر، میر اثر اور مرزا شوق معروف مثنوی نگار ہیں۔ ہمارے قومی شاعر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس صنف کو برتا ہے۔ ان کی معروف نظم 'ساقی نامہ' مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا!　　　وہی جام گردش میں لا ساقیا!

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا　　　مری خاک جگنو بنا کر اڑا

خرد کو غلامی سے آزاد کر　　　جوانوں کو پیروں کا استاد کر

رباعی

رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چار کے ہیں۔ رباعی سے مراد ایسی صنفِ شاعری ہے جس کے چار مصرعوں میں ایک مکمل مضمون بیان کیا جائے۔ بالعموم رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ اگر چاروں مصرعے بھی ہم قافیہ و ہم ردیف ہو جائیں تو اس کی بھی ممانعت نہیں ہے۔ رباعی کے چوبیس خاص اوزان ہیں۔ رباعی میں عاشقانہ جذبات اور صوفیانہ خیالات کے ساتھ ساتھ واقعاتِ کربلا اور واقعاتِ کربلا کی مدد سے اہلِ بیت کی مدحت، صبر و استغنا، عزم و استقلال، اخوت و بردباری، وفاداری و جاں سپاری، ایثار و قربانی، حق پرستی و راست بازی، صداقت و امانت، عجز و انکسار اور ظلم و شقاوت کی مذمت کے موضوعات رباعی میں شامل ہیں۔ اس طرح رباعی اصنافِ سخن میں نہ صرف بڑی موقر و ممتاز اور باوقار شمار ہوتی ہے بلکہ اخلاقی شاعری کا سب سے عمدہ نمونہ اور اخلاقی شاعری کی ترجمان سمجھی جاتی ہے۔ یہ دو رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

گلشن میں صبا کو جُستجو تیری ہے — بلبل کی زباں پہ گُفت گُو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا — جس پھول کو سونگھتا ہوں، بُو تیری ہے (میرانیس)

جوانوں کو مری آہ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے (علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ)

قطعہ

قطعہ کے لغوی معنی ٹکڑا یا جزو یا کاٹا ہوا کے ہیں۔ اصطلاحِ شعر میں دو یا دو سے زیادہ شعروں کو جو موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے متعلق ہوں، قطعہ کہتے ہیں۔ قطعہ دو شعروں سے کم کا نہیں ہوتا اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں مگر قطعہ میں بالعموم مطلع نہیں ہوتا بلکہ قطعہ کے پہلے مصرعے میں قافیہ نہ لانا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ قطعہ کو قطعہ اس واسطے کہتے ہیں کہ وہ مطلع کو چھوڑ کر قصیدے یا غزل کا ٹکڑا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ دو قطعے ملاحظہ کیجیے:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا — یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا
(میر تقی میر)

پھاوڑا کندھے پہ رکھے آ رہا ہے اک کسان — رنگ جس کے خون سے لیتے ہیں گلزاروں کے پھول
دل میں جینے کی تمنائیں ، فضا ناساز گار — آنکھ میں سُرخی ، لبوں پہ پپڑیاں ، نتھنوں میں دُھول
(احسان دانش)

مخمس

مخمس عربی زبان کا لفظ ہے جو ''خُمس'' سے نکلا ہے۔خمس کے معنی پانچ کے ہیں۔اصطلاح میں مخمس ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کا ہر بند پانچ مصرعوں پر مشتمل ہو۔مخمس میں چار مصرعے ہم قافیہ اور پانچواں مصرع مختلف ہوتا ہے۔اس صنف کو بہت سے شعرا نے اپنی شاعری میں برتا ہے۔نظیرا کبرآبادی کی نظمیں: آدمی نامہ، برسات کی بہاریں، مفلسی اور علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی نظم: روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے وغیرہ مخمس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ''مفلسی'' کا پہلا بند ملاحظہ کیجیے:

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی — کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی — بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

(نظیرا کبرآبادی)

مسدّس

مسدّس عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چھے کے ہیں مگر اصطلاح میں مسدس سے مراد ایسی نظم ہے جس کا ہر بند چھے مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔اس صنف کے پہلے چار مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں جب کہ پانچواں اور چھٹا مصرع الگ قافیے کے حامل ہوتے ہیں۔کلاسیکی دورِ شاعری سے لے کر جدید دورِ شاعری تک اردو کے بڑے بڑے شاعروں نے اس صنف کو بہت استعمال کیا ہے اور اس صنف میں تمام طرح کے مضامین بیان کیے ہیں۔نظیرا کبرآبادی کی بیشتر زبان زدِ خاص و عام نظمیں ''آدمی نامہ''، ''تندرستی''، ''بڑھاپے کی سواری'' اور ''دنیا دارالمکافات ہے'' وغیرہ اسی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔مولانا حالی کی معرف نظم ''مدّو جزرِ اسلام'' مسدس کی ہیئت میں ہے۔علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی شہرہ آفاق نظمیں ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' بھی مسدس کی ہیئت میں ہیں۔میر انیس اور مرزا دبیر نے اپنے مرثیوں کے لیے بھی اسی ہیئت کو پسند کیا ہے بلکہ میر انیس کے بعد بھی تمام مرثیہ نگاروں کو مسدس کی ہیئت ہی مرغوب رہی ہے۔علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی نظم ''شکوہ'' کا یہ بند، جو شاید سب طلبہ کو ازبر ہوگا، ملاحظہ کیجیے:

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز — قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

آزاد نظم

جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، آزاد نظم قافیہ ردیف کی پابندی سے آزاد ہوتی ہے۔ اسے انگریزی میں Free Verse کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کا رواج زمانۂ قدیم ہی سے ہے جب کہ انگریزی زبان کی دیکھا دیکھی دورِ جدید میں اس نے اردو میں بھی اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے ہیں۔

آزاد نظم میں ایک ہی بحر ہوتی ہے مگر بحر کے ارکان کی تقسیم شاعر کی مرضی پر منحصر ہے۔ بعض اوقات ایک رکن دو مصرعوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، اس طرح کوئی مصرع چھوٹا اور کوئی بڑا ہوتا ہے۔ بعض شعرا صوتی تاثرات کا خیال رکھتے ہوئے اپنی نظم کے کچھ مصرعوں میں قافیے اور ردیف کا بھی اہتمام کر لیتے ہیں۔

آزاد نظم کی سب سے بڑی خوبی رفعتِ تخیّل ہے۔ اگر نظم میں فکر و خیال کی بلندی اور جدّت نہیں تو پھر اس صنف میں طبع آزمائی کرنا بھی بیکار اور لا حاصل ہے۔ مجید امجد کی نظم ''آٹو گراف'' کا آخری حصّہ ملاحظہ کیجیے:

میں اجنبی، میں بے نشاں
میں پا بہ گِل
نہ رفعتِ مقام ہے، نہ شہرتِ دوام ہے
یہ لوحِ دل ، یہ لوحِ دل
نہ اس پہ کوئی نقش ہے، نہ اس پہ کوئی نام ہے

ترکیب بند/ترجیع بند

ایسی نظم جس کے ہر بند میں مسلسل چھے سے آٹھ شعر ہوتے ہیں۔ آخری شعر کے علاوہ ہر بند کے تمام اشعار پہلے شعر کے مطابق ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں، ترکیب بند کہلاتی ہے۔ ایک ہی شعر یا ایک ہی مصرع اگر ہر بند کے آخری شعر میں تکرار کے ساتھ یعنی بار بار آئے تو ایسی نظم ترجیع بند کہلائے گی۔

معرّیٰ نظم

ایسی نظم جس میں بحر اور ارکانِ بحر کی تو پابندی ہو لیکن قافیہ و ردیف کی پابندی نہ کی جائے۔

سانیٹ

یہ صنف انگریزی شعری ادب سے اردو میں آئی۔ سانیٹ چودہ اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں قوافی کی ترتیب بدلتی رہتی ہے۔ اس نظم میں دو بند ہوتے ہیں۔ عام طور پر پہلا بند آٹھ اور دوسرا چھے اشعار پر مشتمل ہوتا ہے۔ شاعر پہلے بند میں اپنے بنیادی جذبے یا خیال کو پھیلاتا ہے اور دوسرے بند میں مضمون مکمل کرتا ہے۔

ہائیکو

ہائیکو صرف تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ایسی جاپانی صنف نظم ہے جو مکمل طور پر فطرت نگاری کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہ صنف پنجابی ماہیے کے بہت قریب کی چیز ہے اور اردو میں بھی روز بروز مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

رات کے پچھلے پہر چپکے سے
ایک تصویر مجھ سے کہتی ہے
اب تو اختر شمار سو جاؤ (ڈاکٹر اختر شمار)

(ب) اصنافِ نثر

اصنافِ نثر کی معروف اقسام میں داستان، ناول، افسانہ، ڈراما، سوانح عمری، خودنوشت، خاکہ، سفر نامہ، مکتوب نگاری اور مضمون نویسی شامل ہیں۔ ذیل میں ان سب کا حال اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے:

داستان

سنانے اور کہنے کی چیز کو کہانی کہتے ہیں۔ کہانی کا مترادف لفظ قصّہ یا حکایت ہے۔ داستان قصّے کہانی کی قدیم ترین قسم ہے۔ کسی زمانے میں قصّہ خوانی یا داستان گوئی باضابطہ ایک فن ہوا کرتا تھا جو عربی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوا۔ برِعظیم میں اس کا آغاز دکنی دور سے ہوا جو از اں بعد برِعظیم کے طول و عرض میں پھیل گیا۔ بڑے بڑے شہروں اور دیہاتوں میں داستان سننے سنانے کے لیے باقاعدہ جگہیں اور وقت مقرر ہوا کرتے تھے، جہاں لوگ کشاں کشاں آتے اور بڑے انہماک سے داستان سنتے تھے کچھ قدیم شہروں خصوصاً حیدر آباد (دکن)، دلّی، لکھنؤ اور لاہور وغیرہ میں ایسی جگہوں کی نشان دہی آج بھی بآسانی کی جاسکتی ہے۔ انشاءاللہ خاں انشا کے اس شعر میں پنجاب کی دھرتی کی مشہور لوک داستان کا ذکر موجود ہے، وہ لکھتے ہیں:

کہانی ایک سنائی جو ہیر رانجھا کی
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لُوٹ لیا

پشاور کا قصّہ خوانی بازار آج بھی اسی زمانے کی یادگار ہے۔ اردو میں داستان نویسی کا دور تقریباً ایک صدی تک قائم رہا۔ قدیم داستانیں اپنی گونا گوں خوبیوں کی بدولت نہ صرف انتہائی دل چسپ ہوا کرتی تھیں بلکہ یہ اخلاقی اقدار اور زبان کے اعتبار سے بھی خوب صورت مرقعے تھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس صنف کا چلن کم ہوتا گیا اور جدید اصناف نے اپنے لیے جگہ بنالی۔ داستان جیسی دل چسپ صنف کے بارے میں ثاقب لکھنوی کا یہ شعر لائقِ توجہ ہے:

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ناول

ناول (Novel) انگریزی کا لفظ ہے جو اطالوی زبان سے ماخوذ ہے۔ ناول کے معنی ''نیا، انوکھا یا اچھوتا'' کے ہیں مگر ادب کی اصطلاح میں ناول سے مراد وہ قصّہ لیا جاتا ہے جس میں واقعات خلافِ قیاس نہ ہوں۔ داستان کے برعکس ناول کی بنیاد حقیقت اور فطرت پر اٹھائی جاتی ہے اور فرضی، خیالی اور مافوق الفطرت باتوں سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ ناول کا موضوع ''انسان'' ہے۔ آج کا انسان طرح طرح کے حالات وواقعات سے دو چار ہوتا اور متنوع مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ ناول ان سب موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ گویا ناول نے انسان کو تخیّل اور تصوّر کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنا سکھایا۔ اس بنا پر ناول کو کئی قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے جن میں سے اہم مندرجہ ذیل ہیں:

اصلاحی ناول، سماجی ناول، سیاسی ناول، تاریخی ناول، مہمّاتی ناول، جاسوسی ناول، نظریاتی ناول۔

مربوط قصّہ ناول کی بنیاد ہے جب کہ سلاست اور روانی ناول کی ضرورت ہوتی ہے۔ قصّے کی مختلف کڑیوں کو کسی خاص ترتیب سے جوڑنے کا نام پلاٹ ہے۔ ناول کی کہانی کو مختلف کرداروں کے ذریعے بڑھایا جاتا ہے۔ یہ تمام کردار جس مرکزی کردار کے گرد گھومتے ہیں اس کو ہیرو (Hero) کا نام دیا جاتا ہے۔ ناول نگاری میں اسلوب کی بھی بہت اہمیت ہے اور کرداروں کے مابین مکالموں اور منظر نگاری سے بھی کام لیا جاتا ہے لیکن بہر کیف ناول کسی مقصد کے تحت لکھا جاتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا سب سے پہلا ناول نگار اور ان کے ناول ''مرأۃ العروس'' کو پہلا ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔

افسانہ

افسانہ ایک ایسی مختصر تحریر کا نام ہے جس میں کسی واقعے، کردار یا لمحے کی جھلک دکھائی جاتی ہے۔ اردو زبان میں افسانہ انگریزی ادب کے اثر سے آیا۔ مغربی زبانوں میں افسانے سے پہلے طویل قصّے کہانیاں اور ناول لکھنے کا رواج تھا مگر جوں جوں انسان عدیم الفرصت ہوتا گیا تو کسی ایسی صنفِ ادب کی ضرورت محسوس ہوئی جو کم سے کم وقت میں پڑھنے والے کو مسرّت اور تسکین کے لمحات میسّر کر سکے، چناں چہ افسانہ لکھا جانے لگا، جس کے اثرات ہندوستان میں بھی تخلیق کیے جانے والے ادب پر بھی پڑے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اختصار افسانے کی سب سے بڑی خصوصیت ہے یعنی افسانے میں بیان ہونے والی کہانی اتنی مختصر ہونی چاہیے کہ اسے ایک ہی نشست میں بخوبی پڑھا جا سکے، اس لیے وحدتِ تاثر اس کا بنیادی عُنصر ہے اور اس میں مرکزی خیال کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ناول کی طرح افسانے میں بھی اسلوبِ بیان، کردار نگاری اور مکالمہ نویسی بہت اہم سمجھے جاتے ہیں۔ ناول اور افسانے میں فرق یہ ہے کہ ناول نگار قاری کے لیے کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتا اور اس میں پوری تفصیل بیان ہوتی ہے مگر اب زمانہ اور ہے، پڑھنے والے بھی تیز ہیں، وہ کچھ کڑیاں خود ملا لیتے ہیں، چناں چہ افسانے میں جا بجا ٹکڑے نظر آ سکتے ہیں، جنھیں ایک اچھا قاری خود ملا لیتا ہے۔ افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ کم از کم الفاظ کا استعمال کرے اور الفاظ سے زیادہ جذبات سے اپنے افسانے کو نمایاں کرے۔ آج اردو افسانے کو عالمی ادب میں ایک باوقار مقام اور اونچا مرتبہ حاصل ہے، یہاں تک کہ ان لکھنے والوں میں سے بعض کے افسانوں کو دنیا کے بہترین افسانوں کے موازنے میں بخوبی رکھا جا سکتا ہے۔

ڈراما

لفظ ''ڈراما'' یونانی لفظ ڈراؤ (Drao) سے مشتق ہے جس کے معنی ''عمل کر کے دکھانا'' کے ہیں لیکن ادب کی اصطلاح میں ڈراما ایسی صنفِ ادب ہے جس میں ایک مکمل کہانی ہوتی ہے جو کرداروں کی حرکات و سکنات اور مکالموں کے ذریعے سٹیج پر پیش کی جاتی ہے، اسی لیے ارسطو نے اسے کسی ایسے عمل کی نقالی سے تعبیر کیا ہے جو مکمل ہو۔ ڈرامے کے اجزا میں نہ صرف کہانی، پلاٹ، کردار اور مکالمے اہمیت کے حامل ہیں بلکہ اس کے لیے سٹیج، پس منظر، موسیقی اور کرداروں کا عمل بھی اتنا ہی اہم ہے کیوں کہ ان باتوں کا تعلق براہِ راست ڈرامے کی پیش کش سے ہے۔ تاثر کے اعتبار سے ڈرامے کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ المیہ **(Tragedy)** ڈرامے کی اس قسم میں کہانی دردناک واقعات سے تشکیل پاتی ہے اور اندوہ ناک صورتِ حال کی تصویر کشی سے رحم اور دردمندی کے جذبات کو اُبھارا جاتا ہے۔

۲۔ طربیہ **(Comedy)** یہ انوکھے اور خوش گوار واقعات سے ترتیب دیا گیا ڈراما ہوتا ہے جس کا عمومی مقصد تفننِ طبع اور تفریح

ہوتا ہے۔ کہیں کہیں اس میں ایسا طنزیہ انداز بھی اختیار کیا جاتا ہے، جس سے انسانی زندگی میں اصلاح یا خامی کی نشان دہی مقصود ہوتی ہے۔

ڈرامے کا بنیادی عُنصر کہانی ہے۔ اسی کا تانا بانا ڈرامے کا پلاٹ ہے۔ منطقی طور پر کہانی میں جس قدر باطنی و معنوی ربط ہوگا، اسی قدر کہانی اچھا تاثر دے گی۔ ڈراما کے سلسلے میں اہم ترین نام آغا حشر کاشمیری کا ہے۔ آغا حشر کے بعد جن ڈراما نگاروں نے اس صنف میں نام پیدا کیا، ان میں سید امتیاز علی تاج اپنے ڈرامے ''انارکلی'' اور حکیم احمد شجاع ''باپ کا گناہ'' کی بنا پر بڑے مشہور ہوئے۔ میرزا ادیب نے اردو ڈرامے کے ذخیرے میں اہم اضافہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ سعادت حسن منٹو، آغا بابر، رفیع پیرزادہ،، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انتظار حسین، خواجہ معین الدین، کمال احمد رضوی، امجد اسلام امجد، حسینہ معین، یونس جاوید اور اصغر ندیم سید ممتاز ڈراما نگار ہیں۔ ہمارے ہاں سٹیج ڈراموں کی حالت تو شاید اتنی اچھی نہیں مگر ٹی وی ڈراموں کو آج بھی ہر جگہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

خاکہ

خاکہ کے لغوی معنی ابتدائی نقشہ یا ڈھانچا کے ہیں۔ خاکے سے مراد کسی شخص کی لفظی تصویر کشی ہے۔ خاکے کو شخصی مرقّع یا شخصیت نگاری بھی کہتے ہیں۔ خاکہ نگار کو خاکے کا موضوع بننے والی شخصیت کے مزاج سے مکمل آگاہی ہونی چاہیے۔ بنیادی طور پر خاکہ اختصار، جامعیت اور دل آویز زبان و بیان کا حامل ہونا چاہیے۔ اردو کے پہلے خاکہ نگار مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں، جنھوں نے اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد کا لاجواب خاکہ لکھا ہے۔ خاکہ نگاری کے ضمن میں مولوی عبدالحق، مولانا عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، رشید احمد صدیقی اور اشرف صبوحی کے نام اہم ہیں۔ نئے خاکہ نگاروں میں افضل علوی، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر علی محمد خاں، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر یونس بٹ اور گُلِ نوخیز اختر شامل اور مقبول ہیں۔

سفرنامہ

سفرنامہ دراصل روداد کی ایسی قسم ہے جس میں مصنف اپنے سفر و سیاحت کا حال مفصّل بیان کرتا ہے۔ سفرنامے میں اس کے ذاتی مشاہدات اور تجربات شامل ہوتے ہیں۔ سفرنامے لکھتے وقت مصنف کے اسلوب میں جدت اور دل کشی ہونی چاہیے۔ اردو زبان میں یوسف حسین خاں کمبل پوش کا سفرنامہ ''عجائباتِ فرنگ'' پہلا سفرنامہ ہے۔ مولانا شبلی نعمانی، محمود نظامی، بیگم اختر ریاض الدین، ابنِ انشا، عطاالحق قاسمی اور مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے بھی قابلِ تعریف ہیں۔

مضمون

کسی خاص موضوع پر بحث کو احاطۂ تحریر میں لانا مضمون نویسی کہلاتا ہے۔ مضمون ایک ایسی تحریر ہے جس میں زندگی کے کسی بھی شعبے سے متعلق کسی بھی موضوع پر اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مضمون کی بالعموم ایک خاص ترتیب ہوتی ہے۔ سب سے

پہلے زیرِ بحث موضوع کا تعارف کرایا جاتا ہے اور پھر اس کے بارے میں معلومات پیش کرنے کے بعد نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

مضمون قدرے مختصر مگر جامع ہونا چاہیے چوں کہ روزمرہ بول چال کی زبان سب سے عمدہ تحریر ہوتی ہے اس لیے مضمون نگار کو چاہیے کہ وہ روزمرہ سے قریب رہ کر حتی الامکان شگفتہ اور رواں زبان استعمال کرے۔ مضمون نگار کے لیے موضوع کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کیوں کہ اگر مضمون نگار موضع سے منسلک نہ رہے گا یا خیالات کی ترتیب کو گڈمڈ کر دے گا تو اس کا مضمون اچھا تاثر پیش نہیں کرے گا۔

اردو ادب میں مضمون نگاری کی روایت میں سر سیّد احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ، الطاف حسین حالی، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، عبدالحلیم شرر، میر ناصر علی، حافظ محمود شیرانی، مہدی افادی، رشید احمد صدیقی، وحیدالدین سلیم وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

آپ بیتی

آپ بیتی سے مراد ہے ان حالات، واقعات اور کیفیات کا بیان جن سے کوئی شخص خود گزرا ہو۔ اپنی ذاتی زندگی کے احوال و واقعات کا ایسا بیان آپ بیتی یا خودنوشت کہلاتا ہے جس میں مصنّف کی داخلی کیفیات اور احساسات بھی شامل ہوتے ہیں۔ زندگی کا غیر جانب دارانہ جائزہ اور متاثر کن اسلوب، ایک اچھی آپ بیتی کی خصوصیات ہیں۔ اردو آپ بیتی آغاز علامہ جعفر تھانیسری کی خود نوشت ''کالا پانی'' سے ہوا۔ اردو زبان و ادب کے حوالے سے مولانا حسرت موہانی کی ''قیدِ فرنگ'' ایک بہترین خودنوشت ہے۔ دیوان سنگھ مفتون کی ''ناقابلِ فراموش''، جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات''، احسان دانش کی ''جہانِ دانش'' اور قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' جیسی تحریریں بھی اردو ادب کا سرمایہ ہیں۔

سوانح عمری

نوعیت کے لحاظ سے سوانح عمری اور آپ بیتی ایک جیسی صنفِ نثر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے آپ بیتی اپنی ذاتی زندگی کی ترجمانی اور کہانی ہے جب کہ سوانح عمری کسی دوسرے شخص کی۔ سوانح عمری کے لیے وہی اسلوب درکار ہے جو آپ بیتی کے لیے ہوتا ہے۔ سوانح نگاری کی اضافی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ غیر جانب داری کا مظاہرہ کرے اپنے جذبات سے شخصِ مخصوص کی نہ تو بلاوجہ کی مداحی کرے اور نہ ہی اس کی تذلیل کرے۔ مولانا حالی کی حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب، حیاتِ سعدی اور مولانا شبلی نعمانی کی الفاروق رضی اللہ عنہ، المامون، الغزالی رحمۃ اللہ علیہ اور سوانح مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اردو کی مشہور سونح عمریاں ہیں۔